"آپ ایڈیس کو سلکس کے متعلق بتا رہے تھے سر!"

"یس یس یس یس . . . " وہ کتنی ہی دیر یس یس کہتے رہے جیسے اس اثبات کی ڈوری سے بھاگتے ہوئے خیالات کی مچھلی کو واپس پکڑ رہے ہوں۔

"میں آپ کو بتا رہا تھا۔ ماں بچے اور باپ کا رشتہ بڑا منفرد اور الجھیلا ہے۔ اس رشتے کو اگر آپ پری جن اور بونے کا رشتہ سمجھیں تو بہت جلد فرق واضح ہو جائیگا۔ ماں وہ پری ہے جس سے بچہ اگرچہ کہ بونا ہے لیکن جس میں جبلّی خواہش مکمل نہیں محبت کرتا ہے ماں سارا دن اس بونے سے کھیلتی ہے۔ اس کے کپڑے دھوتی ہے۔ اسے کھانا کھلاتی ہے۔ اسے پوٹی پر بٹھاتی ہے۔ ماں کا محور یہ بونا رہتا ہے۔ اچانک شام کو کہیں سے آدم بو آدم بو پکارتا ایک جن آجاتا ہے۔ اور پری اس جن کی خاطر بونے کی پروا نہیں کرتی۔ . . آپ کا کیا نام ہے مس؟

رشو یکدم اٹھ کر بولی۔

"مس رشیدہ میر"

"بیٹھئے بیٹھئے۔"

رشو کے کھڑا ہونے پر ساری کلاس بہت محظوظ ہوتی۔

بہاولپور میں شاگرد کھڑے ہو کر جواب دیتے ہوں تو خیر ادھر لاہور کے لئے یہ طریقہ بالکل جنگلی تھا۔ ظفر نے پیچھے سے ذرا سا ہاتھ بڑھایا۔ اور رشو جان کے دوپٹے کو جھٹکا دیا۔ وہ جھٹکا کھا کر پچاکھائی پلنگ کی طرح کرسی میں گر گئی۔

"میں کہاں تھا لڑکو ؟" ڈاکٹر اعجاز نے پھر بار سانئی طرح ناک صاف کر کے پوچھا۔

"پری کا جن کی خاطر ہونے کی پروا نہیں کرتی سر۔"

کچھ دیر انہوں نے پس پیش کہنے میں گذاری۔ خیالات مجتمع ہو گئے تو لیکچر رواں ہو گیا۔

"بونا شام کے وقت سے ڈرتا ہے جب یکدم اس کا پری اس جن کی ہو جائے گی جس کا مقابلہ جسمانی طور پر وہ نہیں کر سکتا۔ اگر معاملہ یکطرفہ محبت کا ہوتا تو پھر اس میں مشکلات نہ ہوتیں۔ لیکن الجھاؤ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب بونے کو اس جن سے بھی محبت ہوتی ہے۔ اور پری سے بھی۔ اور وہ دونوں ہی اسے پیار کرتے ہیں۔ وہ دل سے اس جن کو ختم کرنے کی تمنا بھی رکھتا ہے۔ اور اپنی اس تمنا سے چڑتا بھی ہے۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے وجود کو گھناؤنا اور باعثِ شرم سمجھتا ہے۔ آپ کہاں سے آئی ہیں مس رشیدہ۔"

مارے ادب کے پھر اس نے اٹھ کر کہا۔ "جی بہاولپور سے۔"

اس بار تو قہقہہ اتنا بلند تھا۔ جیسے بہت سارے کوے یکبارگی اڑے ہوں۔

"بیٹھیے بیٹھیے پلیز . . . ہاں تو میں کہہ رہا تھا جب یہ مثبت اور منفی جذبات بچے کے دل میں پیدا ہو جائیں اور اس کی شخصیت کنفلکٹ میں مبتلا ہو جائے تو ایڈیپس کمپلیکس کا بیج بو دیا جاتا ہے . . . کچھ جن اور پریاں عقلمند نہیں ہوتے وہ آپس میں محبت کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ پری بھی بونے کے ساتھ مل کر کھانے کا میدہ ہے۔ بچے کو احساس دلانا کہ . . . محبت ایک دو پہیے کی سائیکل ہے۔ انسانی شخصیت پر دانستہ ظلم

ہے۔ محبت میں بچّے کو شریک نہ کرنا اسے حسد اور رشک کے رستے رہنے سے بچنے کا یہ احساس جو شروع میں تھوڑی سی الجھن پر محمول ہوتا ہے، بہت زیادہ جڑیں پکڑ جاتا ہے۔ اس کا اثر جا ہے بظاہر موثر ہو بچّے کی آیندہ زندگی ضرور متعین کرتا ہے۔۔۔ آپ نے بی اے میں کونسے مضمون لئے تھے مس تبیر۔"

اس بار رشیدہ نے اٹھنے کے لئے جسم ابھارا اور پھر اسے بیز بولی۔

"جی اکنامکس اور سائیکلوجی۔"

"یس یس۔۔۔ ویری گڈ۔۔۔ ہم اڈیپس کومپلکس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا۔۔۔" انہوں نے انگریزی میں پوچھا۔

رشیدہ نے اثبات میں سر ہلایا کیونکہ آواز اس کے حلق میں جم کر بیٹھ گئی تھی۔

"کچھ بچّے معاشرے کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ اور ان کے کردار میں انضباط پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ہم آہنگی سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھوتہ، یہ ہم آہنگی بھی قدرتی چیزوں کی طرح ہے۔ مثلاً بجلی اور ہوا۔۔۔ ہم ان کے وجود کو اس وقت سمجھتے ہیں جب انکے کارنامے دیکھتے ہیں۔ ہم آہنگی اور انضباط کو سمجھنے کے لئے بھی ہمارے پاس یہی پیمانہ ہے کہ فلاں شخص سوسائٹی میں کس حد تک سمویا گیا ہے بغیر الجھاؤ کے۔۔۔ جو کردار بچپن کے الجھاؤ کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتے اور اڈیپس کومپلکس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے متعلق میں پھر بات کروں گا۔ ہم پھر یہاں واپس آئیں گے۔ فی الحال دو چار باتیں مجھے ایسی سوسائٹی کے متعلق کرنا ہیں، جہاں محرموں کے ساتھ مباشرت قابل اعتراض نہیں، یعنی جہاں اڈیپس

کمپلیکس کے پیدا ہونے کے امکانات کم ہیں، . . . آپ کہاں رہ رہی ہیں مس سابرہ ہوسٹل میں کہ کسی رشتہ دار کے پاس؟ . . .“

”جی رشتہ داروں کے پاس۔“

”آئی سی . . . ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ نوٹ کر لیجیے کہ مہذب سوسائٹی کا تانا بانا ایسا ہے جہاں محرموں کے ساتھ جنسی تعلقات ناجائز سمجھے جاتے ہیں۔ ایسی سوسائٹی ذہنی الجھنوں میں زیادہ مبتلا ہوتی ہے۔ لیکن دنیا کے کچھ خطے ایسے ہیں جہاں نہ تو لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہے۔ اور نہ ہی اسے گناہ سمجھا جاتا ہے۔ سسلی میں باپ بیٹی کے ناجائز تعلقات قابلِ اعتراض نہیں۔ ہوائی کے شاہی خاندان میں بھائی بہن کی شادی عام ہے۔ مصری تہذیب اور انکاس کی سوسائٹی میں ان باتوں کو معمولی سمجھا جاتا تھا۔ یس مس الکیا ہے؟“

رشیدہ کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اور وہ یوں محسوس کر رہی تھی۔ جیسے وہ بالکل برہنہ کھڑی ہے۔ اور گلی کے بچے اس کے ارد گرد تالیاں پیٹ رہے ہیں۔

”پری جن اور بونے کی کہانی تو آپ کو سمجھ آ گئی ہو گی۔ اب میں کہانی کا وہ رخ دکھانا چاہتا ہوں جہاں بچی اور باپ کا رشتہ الفت جو بظاہر نہایت سادہ ہے“ الجھتا ہے۔

لڑکا بچپن سے مخالف جنس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا گر سیکھ لیتا ہے۔ مکتب زندگی میں اس کی ماں سب سے بڑی استاد، دوست اور غمگسار ہوتی ہے۔ لڑکی کے پاس یہ مواقع کم ہوتے ہیں۔ وہ باپ کے پاس کم رہتی ہے۔ اس کی محبت میں وارفتگی، جنون اور پرستش ہوتی ہے۔ لڑکا قتل کے منصوبے بناتا ہے۔ لیکن ہم آہنگی میں اسے سہولت

ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ مخالف جنس کو فطری طور پر سمجھنے لگتا ہے۔ اسے یہ سمجھ پیدا کرنے میں ماں کی مدد ملتی ہے۔ . . . بچی کے لئے اڈیپس کمپلکس میں گرفتار ہونے کے مواقع زیادہ ہیں اسکی ایڈجسٹمنٹ (Adjustment) زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ یہ رابطہ بظاہر بھی اور بباطن بھی الجھاؤ پر مبنی محبت پر مبنی ہوتا ہے۔ آپ لوگ سمجھ رہے ہیں نا ؟ . . . آپ مس رشیدہ؟"

"جی . . ."

کہنے کو تو رشیدہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن اس کا دل کبوتری کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ سفید رومال میں ناک کو بعوں کرکے صاف کرنے والا پروفیسر، اسکی پشت پر بلیک بورڈ، سامنے پڑا ہوا سبز نما ڈسک سب پانی کے عکس کی طرح بل رہے تھے۔

"آپ لوگوں کے فائدے کے لئے میں پرانے عہد نامے میں سے ایک اقتباس لکھ کر لے آیا ہوں۔ یہ ایک ایسی سوسائٹی کا نقشہ ہے جہاں امرد پرستی تو قابلِ اعتراض ہے لیکن بیٹی اور باپ کے جنسی تعلقات پر معاشرہ انگشت نمائی نہیں کرتا۔"

رشیدہ کی بغلوں میں پسینے کی وجہ سے ہلکی ہلکی مہک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس کمرے سے، اس لیکچر سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ بی اے میں بھی اس نے اڈیپس کومپلکس پڑھا تھا، لیکن نہ تو زاویہ یہ تھا نہ اس قدر بیان میں کھلا پن اور بیباکی تھی۔ رشیدہ کی نظریں پیوست فرش ہو گئیں۔ ساری کلاس کھٹا کھٹ کاپیوں پہ نوٹس لے رہی تھی۔ لیکن اس کی انگلیوں میں برف کی تہیں جم گئی تھی۔ سانس میں ناہموار کیفیت تھی۔ اسے وہم سا ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی اسے مرگی کا دورہ پڑنے والا ہے۔

پروفیسر اعجاز حسین نے اپنی نوٹ بک کھولی۔ آنکھوں پر عینک جمائی اور پڑھنے لگے۔

"جب لوط صغر میں داخل ہوا تب خداوند نے اپنی طرف سے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ آسمان سے برسائی۔"

پھر ڈاکٹر نے نظریں کاپی سے اٹھا کر کلاس سے پوچھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ سوڈسی لفظ سدوم سے اخراج کیا گیا ہے۔"

کلاس میں سے بہت سی مثبت آوازیں آئیں۔ ڈاکٹر صاحب پھر پڑھنے لگے۔

"اور لوط صغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں۔ کیونکہ اسے صغر میں بستے ڈر لگا۔ اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا۔ ہمارا باپ بڈھا ہے۔ اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں۔ تاکہ اپنے باپ سے اپنی نسل باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔ پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی۔

اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔ آؤ آج رات بھی اسے مے پلائیں اور تو بھی جا کر اس سے ہم آغوش ہو تاکہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اس رات بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب

اگھڑ گئیں؟ ...... سو لڑکی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔ اور بڑی کے ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام موآب رکھا۔ وہی موآبیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں۔ اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام بن عمی رکھا۔ وہی بنی عمون کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں۔"

گھنٹی بجتے ہی لڑکیاں کرسیوں سے اٹھیں اور لیڈیز روم کی طرف روانہ ہو گئیں۔۔۔ ثریا صفت یہ لڑکیاں بڑی اترابٹ سے لڑکوں کو حیران چھوڑ کر چلدیں۔ ان کے جانے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ سورج مکھی ہیں اور طلبہ وہ شودر ہیں جن کے ساتھ اونچی برہمن جاتی کے لوگوں کو کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔

لیڈیز روم ایک لمبا سا مستطیل کمرہ تھا۔ جسکے عین وسط میں مہاگنی کا بھاری اور مستطیل میز دھرا تھا۔ اس میز کی سطح سپرٹ پالش کی وجہ سے آئینہ کی طرح شفاف، ملائم اور چمکدار تھی۔ میز کے چاروں جانب آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ کونے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل دھرا تھا جس پر چائے کے برتنوں سے لدا ایک ٹرے رکھا تھا۔

لیڈیز روم کا دروازہ کھلتے ہی متعفن پانی، باسی پیسٹری پھپھوندی بھری ہوا کی ملی جلی خوشبو آئی۔ لڑکیوں کے پیچھے پیچھے کتابوں کو چیرا سی کی طرح اٹھائے دبکیلے قدم اٹھاتی، رشو جان بھی لیڈیز روم میں داخل ہو گئی۔

"یہ مائی کہاں گئی آج ۔۔۔" لانبے قد والی طیبہ نے کہا۔

"ہر روز لیڈیز روم بند ملتا ہے ہمیں تو ۔۔۔ میں تو آج ہی پرنسپل صاحب سے

شکایت کرونگی۔ حد ہوگئی۔ کل کے برتن ابھی یہیں پڑے ہیں۔" گلنار نے جلدی جلدی انگریزی میں کہا۔

رشنو ان چہروں کو اس انہماک سے دیکھ رہی تھی جیسے سن بلوغ کو پہنچ کر لڑکیاں فلمیں دیکھا کرتی ہیں۔ سائیکلوجی کی ان چھ طالبات کا نہ تو اسے نام آتا تھا اور نہ ہی اسمیں اتنی جرأت تھی کہ وہ کسی سے اپنا تعارف کروا سکے۔ چپ چاپ ایک آرام کرسی میں دھنسی ٹکر ٹکر سب کا منہ تکنے لگی۔

"توبہ، توبہ! ڈاکٹر اعجاز صاحب تو انتہا کا بور کرتے ہیں۔ . . حد ہے بس" سفید رنگ کے دستانے، لمبوترے پرس سمیت میز پر رکھ کر ایک لڑکی بولی۔

دو لڑکیاں شکل طرظ آپس میں مشابہ اور ایک سے کپڑے پہنے ہوتے تھیں۔ بعد میں رشنو جان کر معلوم ہوا کہ یہ تو طیبے کا دایاں بایاں ہیں۔ بایاں کبھی شکر نہیں کیا جاتا۔ اور دایاں ہر وقت بگڑا رہتا ہے۔ چھوٹی سی ٹھوڑی سے اسے گھورتے رہنا پڑتا ہے۔

طہ جلدی سے کہنے لگی۔

"پروفیسر صاحب نے تو ہمیں بالکل ہی اناڑی سمجھ لیا ہے۔ بی اے کے سٹوڈنٹ کا لیکچر دیتے ہیں پکڑ کر۔"

طہ نے جلدی سے فقرہ جمایا۔

"اور وہ حضرت لوط کا قصہ کیوں لے بیٹھے۔ بیچ میں بالکل غیر ضروری بات۔"

زاہدہ کالا اونچی اونچی شیشے دار کھڑکیاں بند کرنے میں مشغول تھی۔ اس کا سر پیچھے سے مصری ملکہ نفرتیتی کی طرح سڈول لگ رہا تھا۔ جلدی سے سر پھیر کر بولی۔

"توبہ، کالج آکر تو بیحد وقت ضائع ہوتا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ آدمی گھر بیٹھ کر مطالعہ کرے۔ سچ!"

رشو جان نے یہ تبصرہ سنکر یکدم چونکی۔ اس نے جس لمحہ کالج کے پھاٹک کے اندر قدم رکھا تھا۔ اس وقت سے لیکر لیڈیز روم کی ٹھنڈی کرسی پہ بیٹھنے تک ایک ایک لمحہ کبوتری کے پوٹے کی طرح جاندار اور بھرا ہوا تھا۔ وہ پروفیسر جس میں لڑکیاں بیٹھی زمانے بھر کے نقص نکال رہی تھیں۔ رشو جان کو کسی انگریزی فلم کے کیریکٹر ایکٹر کی طرح پرخلوص، تجربہ کار اور بے انتہا قابل لگ رہا تھا۔

کنپٹیوں سے اوپر سفید ہوتے بال، شکاری کتے جیسا دبلا پتلا چہرہ جس پر تجربے کی لکیریں جالے کی طرح تنی تھیں۔ لمبے لمبے ہاتھ جن کی ابھری رگیں بٹی ہوئی ڈوری کی طرح نظر آتی تھیں۔ لہجے میں متانت، بات میں روانی، دلائل میں منطق، انداز میں ٹھہراؤ، رشو جان پر تو اعجاز حسین صاحب کی شخصیت نے اتنا بوجھ ڈالا تھا کہ دل کی کل یکدم پرسیں ہو گئی تھی۔ اس دن کے بعد سے جو سلسلۂ بیعت چلا تو رشو جان پوری طرح سے پروفیسر صاحب کی پیری بن گئی۔ اور ان کے احکامات کو یوں دل سے مانا جیسے اینی بسنت نے مہاتما گاندھی کو دل سے قابلِ پرستش سمجھ لیا تھا۔

لڑکیاں اب پروفیسر صاحب کا تذکرہ چھوڑ کر آپس کے دلچسپ موضوعات پر گفتگو کر رہی تھیں۔ طبلے کے بائیں نے کہا۔

"صبح میں تو نہاری کا ناشتہ کر کے آتی ہوں۔ روز بھائی میاں خود جاتے ہیں نہاری

یعنی۔۔۔۔۔"

وائیں بے سُرے طبلے نے کہا

"اللہ جی! ہمیں تو۔۔۔۔۔ ہوسٹل میں رات کی باسی روٹی کھانا پڑتی ہے۔ خدا قسم جو دودھ ملتا ہے۔ اس میں سے جھینگر نکلتے ہیں کبھی مچھر، میں نے تو دودھ پینا چھوڑ دیا ہے بالکل۔"

ظابول:"اسی سنیچر کو تم ہمارے ساتھ چلنا، میں تمہیں ہریسہ کھلاؤں گی۔ گھر سے بھائی میاں ہری مرچیں، پیاز، اور ادرک کترا کر لے جاتے ہیں۔ پاؤ بھر ولیسی گھی گئے کا گرم کر کے وہ بگھار لگتا ہے وہ مزہ آتا ہے، وہ مزہ آتا ہے کہ کیا بتاؤں۔۔۔ کبھی شب دیگ کھائی ہے تم نے؟"

فرشتو جان نے ان دونوں لڑکیوں کی جانب دیکھا۔ ہریسہ، شب دیگ، نہاری یہ کھانے کی کونسی قسمیں ہیں۔ ان کا نام نہایت روح افزا تھا۔ ان کے نام سنکر یوں احساس ہوتا تھا جیسے کسی مغلیہ سلطنت کے شاہی دسترخوان پر ٹخنے ٹخنے تک کامدار لیٹ کی پشوازیں پہنے کنیزیں نعمتیں چن رہی ہوں۔ چاندی اور سونے کے ظروف کندھوں پر لٹکائے آبدار خانے سے ٹھنڈی صراحیں لاتی ہوئی سیاہ حبشنیں۔ کمخواب کے بیش قیمت گاؤ تکیوں پر ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی مہ پارہ مغلیہ شہزادیوں کا اجتماع، فارسی زبان میں چہلیں۔۔۔ چھوٹے چھوٹے لقمے حلق سے اترتی ہوئی پانی کی غٹ غٹ، انگبیں کے قطرے شیشے کی نالی میں سے ٹپکتے ہوئے۔ فضا میں ہرن کے گوشت کی مہک۔ جائفل جاوتری میں

پکے ہوئے چاولوں کی باس۔ الائچی پان کے پتے اور کیوڑے کی خوشبو . . .
یہ سارا تصور صندل کے جنگل کی طرح مہکا ہوا تھا۔

میز پر سفید دستانے اور لبوترا پرس رکھنے والی ڈمپل امریکی اشتہاروں کی طرح چمکتی اور چمکدار تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں چمکتے دانت، اوپر کو اٹھی ہوئی پلکیں، سر پہ بالوں کی آراستہ پگڑی، کانوں میں پہنے ہوئے لمبے ڈراپ جیسے آویزے، سب کچھ اشتہاری تھا۔ وہ لشٹم پشٹم سوتیوں کی طرح بڑے لچھے دار اور چکنی چکنی انگریزی بولتی تھی۔ اور بولتی چلی جاتی تھی۔ ڈمپل سر کے بالوں سے لیکر جوتی کے پنجے تک، کاروں کے نئے ماڈلوں کی طرح بڑی دلآویز تھی۔

پہلی بار رشتو باجی نے اپنے لمبے کان بالوں تلے چھپا لینا چاہے۔ ڈمپل کے سامنے کسی اور لڑکی کو اپنے آپ کو جنس لطیف سمجھنے کا حق ہی باقی نہیں رہتا تھا۔ وہ میز پر کچھ اس طرح بیٹھی تھی کہ اسکا آدھا دھڑ میز کی سطح پر پوری آب و تاب سے منعکس ہو رہا تھا۔

ڈمپل نے اپنے بالوں کو چھو کر کہا۔ "لیجئے کورٹ پر جب تک فر کا کالر نہ لگے تو کورٹ کا مزہ ہی کیا۔"

"لیکن ڈمپل جان میں تو ہاف کورٹ بنا رہی ہوں . . . بالکل یہاں تک . . ." گھٹنوں تک ہاتھ لے جا کر طیبہ بولی۔

"چاہے کورٹ ہاف ہو چاہے فل۔ ان دنوں فر فیشن میں ہے۔ وہ تو لگوانا ہی پڑے گی کورٹ پر . . ."

کورٹ کے لئے فر؟ رشو جان نے دل میں سوچا۔ ہائے اللہ جی یہ کونسا سوئٹزرلینڈ

ہے کہ کوٹوں پر سمور اور سنجاب کی ہمیک لگانا ضروری ہے۔ ویسے بھی مردار جانوروں کی پوستین چھو کر رشو کو ملگجی سی جھرجھری آجاتی تھی لیکن ڈمپل کی بات سن کر رشو جان ایکبار خیالوں میں کھوگئی۔ ۔ ۔ ہائے کہیں جو واقعی کوٹ کا کالر جھبری سی پوستین سے بنا ہو تو نہ جانے گلے کو کیسا کیسا گدگدائے؟

ڈمپل فرکوٹ سے نکل کر بغیر آستین کے بلاؤز اور نقلی محرموں تک جا پہنچی تھی لیکن رشو جان فر کے سمندر میں ہی ڈبکیاں لگا رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی تو تمام لڑکیاں یک دم خاموش ہوگئیں۔

”کون ہے؟ ۔ ۔ ۔“ ڈمپل نے انگریزی میں سوال کیا۔

”مس! میں ہوں۔ ظفر۔ ۔ ۔“

یک دم لڑکیوں کے کمرے میں پلیٹ فارم جیسی کیفیت پیدا ہوگئی، وہی سرگرمی، وہی شور و غوغا، وہی تو جا میں آ والی بات۔ ۔ ۔

”تم جاؤ۔ ۔ ڈمپل!“

”تو میں کیوں جاؤں۔ تم جاؤ نا! گلنار۔ ۔ ۔ تمہارے تو فیملی کے تعلقات بھی ہیں ان سے۔ ۔ ۔“

طا نطا یکدم ہوا نکلے غباروں کی طرح بولیں۔

”خیر ہم تو پکنک پر جائیں گے نہیں۔ چاہے پروفیسر اعجاز کہیں چاہے پرنسپل صاحب۔ ۔ ۔ ہاں۔ ۔ ۔“

تھوڑی سی وٹیں کٹ جانے سے حالات نارمل پر آگئے۔ بالآخر جب تین بار دروازے پر دستک ہو چکی، تو سفید کورٹ شوز ٹکٹکاتی ڈمپل دروازہ تک گئی۔

"فرمایئے۔"

ظفر علی نے پہلے تھوک نگلا پھر اپنے بالوں پر دست راس پھیرا، اور نظریں جھکا کر گویا ہوا۔

"پھر کیا فیصلہ کیا ہے آپ لوگوں نے؟"

"ابھی تک ہم اپنے اپنے گھر والوں سے مشورہ نہیں کر سکیں۔" ڈمپل نے کیوٹکس لگی انگلیوں سے ناک کریدی۔

"دیکھئے معمولی سی بات کا آپ لوگوں نے اس قدر بڑا اشو (Issue) بنا لیا ہے۔ آپ لوگ سائیکلوجی پڑھتی ہیں۔ کم از کم آپ کو اتنی انہبشن (Inhibition) کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔"

کہنے کو تو ظفر علی کہہ گیا لیکن ساتھ ہی اس کے کان جھنجھنانے لگے۔

"ہم سائیکلوجی ضرور پڑھتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم آزادی کو پسند بھی کریں پروفیسر ضیاء کو اگر آپ کالج میں فیرول پارٹی دے دیتے تو کیا مضائقہ تھا؟ پکنک پر تو شاید ہم میں سے آدھی لڑکیاں بھی نہ جا سکیں۔"

"مس آپ بتایئے بھلا کالج اور شالیمار میں فرق ہی کیا ہے؟ فیرول تو یہاں بھی پروفیسر ضیا کا ہوگا اور وہاں بھی۔ کم از کم پکنک اولڈ فیشن چیز نہیں ہے۔ پارٹی

کی طرح ۔ ۔ ۔ آپ اپنی ساتھی لڑکیوں کو سنا دیجئے ۔ ۔ پلیز! یہ بہت ضروری ہے"
ظفر بولا۔

"میں کوشش کروں گی۔"

"خیر! میں کل آپ سے پوچھنے آؤنگا۔"

"اچھا۔"

"سلام علیکم، مس!"

"وعلیکم سلام ۔ ۔"

وہ بدقت بادلِ ناخواستہ دروازے کی اوٹ چھوڑ کر اپنے اپنے محور کی طرف چل دیئے۔

ظفر علی جب شام کو ہوسٹل میں پہنچا تو باہر والی لان پر لڑکے ٹینس کھیل رہے تھے ہوا میں خنکی لیکن دھوپ میں ابھی تک تمازت تھی۔ گرمیوں کے موسم میں بس اتنی جان رہ گئی تھی جیسے چھپکلی کی دم کٹ کر بھی تڑپتی رہتی ہے۔

وہ غازی کے کمرے میں پہنچا۔ غازی بستر کی چادر سے ایک بڑا سا شیشہ پونچھ رہا تھا۔ رشید کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اور افتخار حسبِ عادت اور حسبِ معمول اپنی پائپ میں تمباکو ٹھونس رہا تھا۔

"ان لڑکیوں کا بھی اندازہ نہیں پایا کسی نے ۔ سج بن کر یوں کالج آتی ہیں کہ احساس ہوتا ہے سوئمبر رچانے آئی ہیں، اور ذرا بات کرو تو چھوئی موئی بن جاتی ہیں، سمٹی پھرتی

ہیں۔ لجائی جاتی ہیں۔ اونہہ . . . " ظفر علی نے گھستے ہی کہا۔

"کیوں ظفر، آج بہت دکھ اٹھائے ہیں کیا لڑکیوں کے ہاتھ؟" نازی نے سوال کیا۔

"ساری سائیکولوجی سمجھ آتی ہے۔ نہیں آتی سمجھ تو ان لڑکیوں کی سائیکولوجی کی۔ ان کو اگر پکنک پر نہیں جانا تھا تو پہلے ہی منہ سے پھوٹتیں، اب جب سب انتظام ہو گئے ہیں تو اتراتی پھرتی ہیں۔ اجازتیں نہیں ملیں ہیں گھر سے۔ . . اونہہ . . "

رشید نے میز سے سر اٹھایا اور آہستہ سے بولا۔

"جب ولسٹن چرچل ہندوستان میں تھا تو اپنے جوانوں سے بات کرنے کے لئے اس نے لفظ انتخاب کئے تھے۔ . . چلو . . . مارو . . . اور تالی ہو۔ لڑکیوں کے معاملے میں بھی یہی تین لفظ کام آتے ہیں۔ چلو . . . مارو . . اور . . تالی ہو۔ "

"تالی ہو کا کیا مطلب ہے۔" افتخار نے سوال کیا۔

"لڑکیوں سے بات کرنے میں خطرہ ہے۔ خطرہ کی علامت دو ہڈیاں ان پر نصب انسانی کھوپڑی . . یہ ہے تالی ہو۔ ہر مہم میں، ہر جانبازی میں تالی ہو ضرور ہوتا ہے۔ ہر لحظہ، ہر لمحہ۔ "

"کن کی باتیں کر رہے ہو؟ آراستہ گڑیا عورت نہیں ہوتی۔ کپڑے، میک اپ اور ہیئر پنوں کا پن کشن ہوتی ہے۔ اسکے وجود سے کپڑا اور پنیں نکال لو تو باقی

نادرہ رہ جاتا ہے تین دن کا باسی ۔۔" افتخار بولا۔

ظفر علی افسردہ خاطر پلنگ پر بیٹھ گیا اور سرد آہ کھینچ کر بولا۔

"لیکن اگر اب لڑکی لوگ پکنک پر نہ گئیں تو پروفیسر اعجاز مجھ پر الزام دھریں گے

سارا ۔۔ عجب مصیبت ہے ۔"

"اصلی عورت تو طوائف ہوتی ہے ۔ دولت اگر اسے پیاری ہے تو وہ جھوٹ

نہیں بولتی ۔ آپ سے عشق کرتی ہے تو بھی جھوٹ نہیں بولتی ۔ مارنا چاہے گی تو مارے

گی اور ضرور مارے گی ۔ مرنا چاہے گی تو ماں باپ کی اجازت لئے بغیر مر جائے گی ۔ دو

کشتیوں پر پیر رکھنا ان کا پیشہ نہیں ہے ۔" غازی بولا۔

سب جانتے تھے کہ جنید غازی کا ہیرا منڈی سے کتنا گہرا تعلق ہے ۔ اس

تعلق کے باوجود اس کے چہرے پر ایک ملکوتی کیفیت رہتی تھی ۔ جیسے دھوبیوں،

لکڑہاروں اور رنگڑوں کو وعظ دے کر سیدھا چلا آ رہا ہو۔

افتخار نے سر اٹھا کر غازی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"تو بھئی اے بی سی ڈی تو لکھ دی سارے گتے پر ۔ اور بھی کچھ لکھنا ہے

کہ بس ؟ ۔۔"

"ایک طرف کونے میں بس لکھو اور دوسری طرف نو ۔۔۔ یہ دونوں ضروری

ہیں ۔"

"پھر وہی بک بک ہونے لگی ہے ۔" ظفر نے پوچھا۔

"تمہارے نزدیک بک بک ہے تو گھر جاؤ مزے سے۔"

"یار نئی بات تو تمہاری روحوں نے کبھی بتائی نہیں۔" ظفر نے کہا۔

"ہمیشہ سوال بھی تو وہی پرانے ہوتے ہیں۔" غازی بولا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ کوئی روح اس گلاس میں آسکتی ہے، کیا یہ ممکن ہے؟"

"بیٹھو، دیکھو اور بات مت کرو۔"

ظفر خاموشی سے بیٹھا ان تینوں کو دیکھتا رہا۔ افتخار نے اس گتے کو میز پر رکھا جس پر انگریزی میں ساری اے بی سی ڈی لکھی تھی۔ غازی نے شیشہ چمکا کر گتے پر جمایا اور رشید کو آواز دی۔

"او نیستی کے بچے۔ ادھر آ، اب تو۔"

پانچ ماچس کی تیلیاں جلانے کے باوجود ابھی تک پائپ نہیں سلگا تھا۔ وہ ویسٹرن فلم کے ہیرو کی طرح جھپ کھاتا اٹھا۔ اور میز کے گرد بیٹھ گیا۔ غازی نے شیشے کے گلاس کو تولیے سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"اور یہ ذات شریف کونسی تھیں جو آج بہاولپور سے آئی ہیں؟"

"ذرا کان لمبے ہیں اس لڑکی کے۔" افتخار بولا۔

کان؟ ... اتنی جلدی تم نے کان بھی دیکھ لئے اس کے؟" رشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"دیکھنے والے لڑکی کو ایک ہی نظر دیکھا کرتے ہیں۔ یہ نظر لڑکی کے سارے وجود کو کارتوس کی طرح

برماتی چلی جاتی ہے۔ اس ایک نظر میں محدّب اور مجوّف شیشہ دونوں فٹ ہوتے ہیں۔

ساری تفصیل پتہ لگ جاتی ہے۔ ایک لمحہ میں ۔ لو بھئی دوستو یہ رہا گلاس۔"

پلانچیٹ کا کھیل جاری ہوگیا۔ رشید افتخار اور غازی میز پر شیشہ رکھ کر اوپر

گلاس اوندھا کر کے اپنی اپنی انگشت شہادت اس پر جما کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہروں پر یکدم

بہت سنجیدگی اور پرہیز گاری آچکی تھی۔

ظفر ان تینوں سے کچھ فاصلے پر بیٹھا سگریٹ پینے میں مشغول تھا خدا جانے کیا بات

تھی لیکن رشیدہ کو کم کم کہہ کر افتخار نے جیسے اس کا موڈ بگاڑ دیا تھا۔

"کوئی اچھی روح جو اس وقت یہاں سے گذر رہی ہے اس گلاس میں آئے اور اس

گلاس کو جنبش دے کر اپنے آنے کی اطلاع دے۔ ۔ ۔ کوئی اچھی روح ۔ ۔ ۔

کوئی اچھی روح۔"

غازی سوتے ہوئے انگریزی میں بار بار اس التجا کی تکرار کرنے لگا۔ بحر الغزال کے

حبشی جادو گروں کی طرح اس کی آواز میں سوز ساز اور گھنا گھنا اندھیرا تھا۔ خط استوا

کے گھنے جنگلوں کی طرح یہ اسرار کی وادی تھی۔ خاموش، اندھیری اور ممنوع۔

"کوئی اچھی روح جو اس وقت یہاں سے گذر رہی ہو۔ اس گلاس میں آئے اور اس

گلاس کو جنبش دے کر اپنے آنے کی اطلاع دے۔"

دو تین بار جب ساحر اپنا منتر پڑھ چکا اور کمرے کی فضا اپنی خاموشی سے بوجھل ہو

گئی تو گلاس ذرا سا ہلا۔ تینوں انگلیاں جو گلاس پہ ہلکے سے دباؤ سے ٹکی تھیں آہستہ

سے لرزیں۔

"اچھی روح ! کیا تم اندر ہو ؟"

گلاس شیشے کی سطح پر گھومنے لگا۔

"اچھی روح اگر تم اس گلاس کے اندر ہو۔ ۔ تو ہمیں تک جاکر اپنے آنے کا سراغ دو۔ ۔" انگریزی میں غازی نے التجا کی۔

غازی کے چہرے پر کسی ایسے لاما کا تجّر، تقدس اور کم سخنی چھائی تھی جس کی ساری عمر عبادت کے چکّر چلاتے گذری ہو۔

"اچھی روح کیا تم یہاں ہو ؟"

گلاس چیں چیں کر کے شیشے پر بھٹکنے لگا۔

"اچھی روح کیا تم ہمارے سوالوں کا جواب دو گی ۔ ۔ بولو ۔ ۔ دو گی اچھی روح" رشید نے پوچھا۔

گلاس بھاگ کر یس کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ بتاؤ پیاری روح ۔ ۔ کشمیر کب پاکستان کو ملے گا ؟"

"یہ بھی کوئی سوال ہے ۔" فوراً انتشار کی بات کو پس پشت ڈال کر غازی نے اپنا سوال جاری کر دیا۔ "کیا وہ پیشہ چھوڑ دے گی بولو ؟"

"اچھی روح ! بتاؤ۔ کیا وہ پیشہ چھوڑ دے گی ؟ اور مجھ سے نکاح کرے گی۔ ۔ بولو۔ ۔ بولو۔ ۔"

روح گلاس کو یس کی طرف گھسیٹ کر لے گئی۔

"اور مجھ سے شادی کرے گی؟" غازی نے پھر پوچھا۔

اب گلاس نو کی طرف بھاگنے لگا۔

غازی نے غمزدہ ہو کر سر جھکا لیا۔

"کیا محمد علی خان کلے اپنا ٹائیٹل تا قیامت رکھے گا۔" رشید نے سوال کیا۔

گلاس مختلف حروف پر تیزی سے پھرنے لگا۔

وہ تینوں حروف کو ملا کر لفظ اور لفظوں کو ملا کر جملے بنانے لگے۔ لیکن جملہ بننے سے ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

"یہ کوئی سوال ہے۔ کوئی ڈھنگ کا سوال کرو یار۔" افتخار بولا۔

"اچھا میں کام کا سوال پوچھتا ہوں . . . پیاری روح یہ بتاؤ۔ یہ نئی لڑکی جو آج کالج میں آئی تھی۔ یعنی رشیدہ میر۔ یہ کہاں کی رہنے والی ہے؟"

گلاس نے بہت جلد بہاولپور لفظ کے ہجے کر دیئے۔

"کیا یہ اچھی لڑکی ہے کہ باقی فرعون زادیوں کی طرح ہے۔" افتخار نے پھر سوال کیا۔

"مختلف" کے ہجے کیے گئے۔

"کیا یہ ہم چاروں میں سے کسی سے محبت کرے گی۔" رشید نے جھک کر گلاس سے سرگوشی کی۔